45

قربانیوں کی ضرورت

(فرمودہ ۱۳ / جون ۱۹۱۹ء)

حضور انور نے تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"ہر ایک قسم کی ترقی جو دُنیا میں کسی کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ بہت سی قربانیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ درحقیقت بڑائی کے معنی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اس میں یا اس کی خاطر بہت سی چیزوں کی قربانی کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور اس کی شان ہی ایک ایسی شان ہے۔ جو اور کسی چیز کی طرف نسبت کئے بغیر بڑائی اور شان ہے باقی سب کی بڑائیاں اور شانیں سب نسبتی اور طفیلی ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کبیر تھا۔ بلکہ اکبر تھا اور ہمیشہ سے تھا اور ہے اور رہے گا۔ وہ علیم تھا اور ہے اور رہیگا۔ وہ حیّ ہے۔ تھا اور آئندہ رہے گا۔ اس کی بڑائی۔ اس کی عظمت اور اس کا علم والا ہونا یہ کسی نسبت سے قائم نہیں، نہ کسی چیز کے طفیل سے ہے، لیکن اس کے سوا۔ یعنی خالق کو علیحدہ کر کے جتنی مخلوق ہے وہ سب کی سب ایسی ہے کہ اس کی تمام ترقیاں نسبتی اور طفیلی ہیں۔ اور کوئی بڑائی کسی کی ذات میں بڑائی نہیں۔ بلکہ نسبت پا کر بڑائی ہے۔ اور کوئی عالم نہیں جب تک دوسرا جاہل مدنظر نہ ہو اور کوئی بڑائی، بڑائی نہیں جب تک کہ دوسرے کی کمزوری زیرِ نظر نہ ہو۔ کوئی حکومت نہیں جب تک اس کے اطاعت گذار نہ ہوں۔ لیکن خدا کی حکومت ایسی ہے کہ بغیر کسی اطاعت کے حکومت ہے۔ اسی طرح اس کی جس قدر صفات ہیں۔ وہ اپنے طور پر ہیں، لیکن باقی سب کی نسبتی طور پر ہیں۔

ایک بڑے بادشاہ کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یہی کہ اس کے لیے بہت سوں نے اپنی حکومت کو ترک کر دیا ہوتا ہے اور جتنا بڑا بادشاہ ہے۔ اتنی ہی زیادہ اس کے لیے لوگوں کو قربانیاں اختیار کرنی پڑیں۔ یا لوگوں نے اپنے علاقے چھوڑ کر اس کے قبضہ کو ان پر تسلیم کر لیا۔ تو یہ بڑائی نسبتی بڑائی ہے۔ تمدنی دنیا میں بھی حکومت اسی طرح ہے کہ خواہ جبر سے خواہ خوشی سے جتنے زیادہ مطیع ہوتے ہیں، اتنی ہی بڑی ان کی حکومت مانی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے اختیار ایک کو دیدیئے۔ اس لیے وہ بڑا بادشاہ

ہوگیا۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی حکومت حکومت نہیں کہلا سکتی۔

اسی طرح دوسرے معاملات ہیں علم کیا ہے یہ بھی قربانیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ کسی چیز کے جاننے کے لیے مال کی، اوقات کی۔ جذبات کی۔ دوست و آشنا کی صحبت کی۔ آرام کی۔ جب قربانیاں کی جاتی ہیں۔ تب علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ ہر قسم کی قربانی اپنے اندر اور بہت سی قربانیاں رکھتی ہے۔ یوں لوگ صرف مال کی قربانی کہدینے سے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے مال نام ہے۔ ان اشرفیوں اور ان روپیوں کا جو اشرفیوں میں ہیں۔ اور ان اٹھنیوں۔ چونیوں۔ دونیوں بیسوں اور ان کے اجزاء کا جو ان میں شامل ہیں۔ پس ان تمام کے قربان کرنے کا نام مالی قربانی ہوتا ہے۔ چونکہ لوگ اس تشریح کو ذہن میں نہیں رکھتے۔ اس لیے اس کی عظمت کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ایک زمیندار اپنے بچے کے پرائمری تک پڑھانے کے لیے چار سو یا پانچسو روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ خرچ کرتا ہے۔ اس لیے وہ خرچ اس کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی شخص کسی زمیندار کو یہ کہے کہ ہم تمہارے لڑکے کو پرائمری پاس کرا دینگے۔ تم ہمیں چار پانسو روپیہ دیدو۔ تو وہ یہی کہے گا کہ اتنے روپیہ کی میں زمین کیوں نہ خرید لوں۔ تو گو وہ خرچ تو سینکڑے ہی کرتا ہے مگر چونکہ وہ پیسہ پیسہ کرکے خرچ کرتا ہے اس لیے اس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا۔ پھر بہت بڑی قربانی آرام کی قربانی ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل جب تک معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس کی اہمیت نہیں معلوم ہوسکتی۔ مثلاً آجکل روزے ہیں۔ طالب علم کا صبح آرام کرنے کو دل چاہتا ہے، مگر خیال یہ ہے کہ مدرسہ میں جانا ہے۔ اس لیے وہ مدرسہ کے لیے اپنے آرام کو قربان کرتا ہے۔ اسی طرح اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو جب پڑھنے کے لیے چھوڑتا ہے تب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وقت کی کتنی قربانی کی ہے۔

پھر جو وقت کی قربانی ہوتی ہے۔ اس کو کون جان سکتا ہے کہ وہ کتنی بڑی ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات کو ذہن میں لاؤ۔ وقت کا خرچ ہونا اور چیز ہے اور خرچ کرنا اور۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک ایسا شخص جو بیکار پڑا رہتا ہے۔ اس کا وقت خرچ ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ خود خرچ نہیں کر رہا ہوتا، لیکن ایک ایسا شخص جو کسی خاص کام میں وقت لگاتا ہے۔ اس کا وقت خرچ نہیں ہوتا بلکہ وہ خرچ کرتا ہے تو بہت لوگ ایسے ہیں جنکا وقت خرچ ہوتا ہے اور بہت کم ہیں جو وقت کو خرچ کرتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے پاس مال ہوتا ہے اور ہر ایک سے خرچ ہوتا ہے، لیکن خرچ کرنا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اور یہ ایک خاص علم ہے جس کا نام علم الاقتصاد ہے۔ جس طرح لوگ انگریزی زبان اور دیگر علوم میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح اس علم میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل ہوتی ہے۔ یہ بہت

وسیع علم ہے۔ مگر بعض لوگ باوجود اس کے پڑھنے کے پھر بھی مال خرچ کرنا نہیں جانتے۔ غرض وقت کی قربانی جب تک آدمی نہ کرے، اس وقت تک اس کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی سمجھ میں یہ قربانی نہیں آسکتی ہاں جو شخص اپنی آرزوؤں کو قربان کرتا ہے۔ ایک خاص مقصد کے حصول کے لیئے اسکو معلوم ہوتا ہے کہ وقت کا قربان کرنا کتنا بڑا کام ہے۔ ایک شخص بغیر ارادے کے سارا دن ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے مگر جب کہا جائے کہ یہاں بیٹھ کر اتنی دیر کسی کا انتظار کرو تو اگر اس سے دس منٹ بھی دیر ہو جائے۔ تو وہ لڑنے کو تیار ہو جائے گا کہ اتنی دیر لگا دی۔ یوں تو سارا دن اسی طرح گذرتا ہے۔ جس طرح ریت مٹھیوں سے گذر جاتی ہے، لیکن کسی خاص مقصد کے لیے دوسرے اشغال کو چھوڑنا مشکل ترین کام ہے۔ جتنی بڑی چیز ہو اتنا ہی زیادہ وقت اس کے لیے قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور چیزوں کی بڑائی چھٹائی قربانیوں کی بڑائی چھٹائی ہی کا نام ہے۔ پھر کسی بڑے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے نہ صرف بڑی قربانیوں کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ صحیح طریق سے قربانیاں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ علم حاصل کرنے کے لیے دس بیس یا سو بکرے ذبح کر دیئے جائیں اور علم حاصل ہو جائے۔ بلکہ اس کے لیے قربانیاں ہوں اور اس کے مناسب قربانیاں ہوں۔ تو مقصد حاصل ہوتا ہے۔

دیکھو انسان کی زندگی کے قیام کے لیے کس قدر قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ غلہ قربان ہوتا ہے پانی خرچ ہوتا ہے۔ ہوا قربان ہوتی ہے۔ روپیہ قربان ہوتا ہے۔ تب جا کر ایک وجود ہلاکت سے بچتا ہے۔ پھر بچوں کی تربیت کے لیے جس قدر زیادہ قربانی کی جاتے۔ اسی قدر وہ بڑے بنتے ہیں۔ بڑے بننے کے یہ معنی نہیں کہ وہ جسمانی طور پر بڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ اچھی تربیت سے وہ شریف ہوتے ہیں۔ اور ملک اور قوم کے لیے مفید اور مذہبی طور پر نیک اور صالح ہوتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے بچوں کی تربیت کے لیے اپنے وقت اور آرام کی قربانی نہیں کرتا۔ اور اس بات کا کچھ خیال نہیں کرتا کہ اس کے بچے کہیں آوارہ ہو کر پھرتے رہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے بچے قوم کے لیے کوئی مفید وجود ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور نہ خود کوئی بڑائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور پھر وہ لوگ جو اپنے لیے آپ قربانیاں کرتے ہیں۔ وہ بھی بہت بڑے درجے پاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آپ کے ابتدائی زمانہ میں کسی نے اپنے وقت۔ اپنے آرام۔ اپنے مال کی قربانی نہیں کی آپ ابھی شکم مادر میں ہی تھے۔ کہ باپ فوت ہو گئے۔ پھر ابھی ننھے بچے ہی تھے کہ ماں فوت ہو گئیں۔ اور ذرا ہوش سنبھالا تھا کہ دادا کا انتقال ہو گیا۔ مگر آپ نے اپنے لیے اور اپنے نفس کی اصلاح اور دنیا کی بھلائی کے لیے وہ وہ قربانیاں کیں کہ جن کے نتائج آج ساری دُنیا دیکھ رہی ہے۔

پس چونکہ بڑائی کے معنی ہوتے ہیں بڑی قربانی کے اور چھوٹائی کے معنی ہوتے ہیں چھوٹی قربانی کے۔ اسی لیے اسلام نے قربانی پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اور مسلمانوں کی کوئی عید نہیں جس کے ساتھ قربانی نہ ہو۔ اسلام میں عام طور پر دو عیدیں مشہور ہیں۔ ایک بڑی کہلاتی ہے۔ ایک چھوٹی۔ بڑی تو وہ ہے جس میں جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ اور چھوٹی وہ جو رمضان کے بعد آتی ہے۔

جس کو بڑی عید کہا جاتا ہے۔ اس میں تو ظاہری قربانی ہوتی ہی ہے۔ اور دوسری عید جو رمضان کے بعد آتی ہے۔ اس تک بھی انسان بہت سی قربانیاں کرنے کے بعد پہنچتا ہے۔ پس درحقیقت کوئی خوشی نہیں۔ اور کوئی عید نہیں۔ جب تک اس کے پہلے قربانی نہ کی گئی ہو۔ دیکھو رمضان کے بعد جو عید آتی ہے اس سے پہلے یعنی رمضان میں کتنی قربانیاں انسان کو کرنی پڑتی ہیں۔ نفس کی قربانی، کھانے پینے کی قربانی۔ شہوات کی قربانی۔ اپنے جذبات اور ارادوں کی قربانی۔ جب مومن اتنی قربانیاں کر چکتا ہے۔ تب عید اُس کو خوش کرنے کے لیے آتی ہے۔ تو ان عیدوں میں ہمارے لیے بڑے بڑے سبق ہوتے ہیں۔ اور ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہر ایک عید اور خوشی کے ساتھ قربانی لازمی ہوتی ہے۔

عید الاضحیٰ کیا ہے۔ یادگار ہے۔ اس قربانی کی جو مدت ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔ اور اس سے ہمیں سبق دیا جاتا ہے کہ یہ ایک اصل ہے جس کے ذریعہ جماعتیں ترقی پاتی ہیں۔ بغیر اس طرح قربانی کئے کوئی جماعت ترقی نہیں پا سکتی۔ جب جماعت کے سارے لوگ اپنے آپ کو قربان کرنے پر آمادہ اور تمام چیزوں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ تب مدعا حاصل ہوتا ہے، ورنہ کسی ایک دو کے قربان ہونے سے جماعتوں کو ترقی حاصل نہیں ہوا کرتی۔ ہاں قربانی صرف گلا کٹوانے کا ہی نام نہیں بلکہ قربانی کے اور طریق بھی ہیں۔ یعنی اپنے تمام ارادوں آرزوؤں کو ایک مقصد کے حصول کے لیے چھوڑ دینا بھی قربانی ہوتی ہے۔ اور یہ ایسی قربانی ہے کہ تلوار کے ذریعہ گردن کٹانے کی قربانی اس کے مقابلہ میں آسان ہے۔ کیونکہ اس سے بہت جلد فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ قربانی ایسی ہوتی ہے کہ ایک ہی وقت میں اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ پھر تلوار سے جو قربانی ہوتی ہے۔ وہ بعض اوقات ناحق کے لیے بھی ہو جاتی ہے۔ عیسائی عورتیں عیسائیت کے لیے سر کٹوا لیتی ہیں مگر وہ قربانی جس میں نفسانیت کو چھوڑنا پڑے شہوات سے علیحدہ ہونا پڑے۔ آرزوؤں اور تمناؤں اور جذبات اور ارادوں کو قربان کرنا پڑے۔ وہ باطل کے لیے نہیں ہو سکتی۔ دیکھو تلوار سے تو بہت تھوڑے صحابہ شہید ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیگر صحابہ شہید نہیں ہوئے۔ حضرت حمزہؓ ہی شہید نہیں ہوتے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ بھی شہید ہوئے ہیں۔ ہاں ان میں فرق تھا تو یہ تھا کہ حضرت حمزہؓ ظاہری تلوار سے شہید ہوتے۔ مگر حضرت

ابوبکرؓ ایک ایسی تلوار کے شہید تھے۔ جس کا ظاہر میں وجود نہ تھا، مگر ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ یہ سب جلیل القدر انسان خطرناک وقتوں میں جنگ کے میدانوں میں گئے۔ اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔ مگر خُدا کی مصلحت تھی کہ ان کو اس وقت بچائے رکھا۔ کیونکہ خدا جانتا تھا کہ وہ وقت آتا ہے جبکہ یہ اسلام کی عظیم الشان خدمتیں بجا لائیں گے۔ اور مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھرنے سے بچائیں گے۔

حضرت علیؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ صحابہؓ میں سے سب سے بہادر کون تھا۔ شیعہ حضرت علیؓ کے متعلق کہا کرتے ہیں۔ کہ شیرِ خدا تھے۔ بیشک وہ شیرِ خُدا تھے۔ مگر شیعوں کی اس سے غرض دوسرے صحابہ کی مذمت کرنا ہوتا ہے۔ ہاں۔ تو حضرت علیؓ نے کہا کہ اس وقت بہادری کا معیار یہ تھا کہ جو سب سے زیادہ رسولِ کریمؐ کے قریب ہوتا تھا۔ وہی سب سے بڑا بہادر سمجھا جاتا تھا۔

یہ بات فوجی نقطۂ خیال سے بالکل درست ہے کیونکہ فوج کا افسر جہاں ہوتا ہے۔ وہی جگہ دشمنوں کی نظر میں سب سے اہم ہوتی۔ اور اسی پر دشمن کا سارا زور ہوتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ طریق تھا کہ اگر افسر مارا جاتا۔ تو ساری فوج بھاگ کھڑی ہوتی۔ تو ایسے معرکے میں جو افسر کے زیادہ قریب ہوتا۔ وہی سب سے زیادہ بہادر سمجھا جاتا اور اسی کی بہادری سب سے بڑھی ہوئی ہونی چاہیئے۔

یہ فرما کر حضرت علیؓ نے کہا۔ اور لڑائی کے وقت سب سے زیادہ آنحضرت کے قریب ابوبکرؓ ہوتے تھے[1] اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ جنگِ اُحد میں ایک آن کی آن کے لیے، جب دشمن آنحضرت اور صحابہ کے درمیان حائل ہو گئے۔ تو اس وقت صرف ابو دجانہ پاس رہ گئے۔ ورنہ ہر خطرناک وقت میں حضرت ابوبکرؓ ہی رسول کریم کے قریب ہوتے تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ تلوار کے ذریعہ شہید نہ ہوئے۔ مگر کیا ان کی شہادت میں کچھ شک ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

تو صحابہ میں سے تھوڑے شہید ہوتے۔ اور زیادہ بغیر تلوار کے قربان شدہ تھے۔ ایسا ہی ہماری جماعت کے لوگوں کو ہونا چاہیئے۔ ہمیں سید عبد اللطیف مرحوم اور عبد الرحمٰن خان کی مثال دیکھ اور ان کی شہادت پر یہ کہہ کر خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ وہ شہید ہو گئے۔ بلکہ خود شہادت کا درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور جب تک ہم خود بھی شہید نہ ہو جائیں۔ دوسروں کی شہادت پر خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ اُنھوں نے اگر شہادت پائی۔ تو اپنا فرض ادا کیا نہ کہ تمہارا فرض ان کے شہید ہونے سے ادا ہو گیا۔ تم میں سے ہر ایک کو اپنا فرض آپ ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک جماعت کا

---

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی حالات سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ

ہر ایک فرد شہید بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اُس وقت تک اصل مدعا حاصل نہیں ہو سکے گا۔ جو مقصد تمہارے پیشِ نظر ہے۔ وہ بہت بڑا ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں قربانیوں کی ضرورت ہے۔ ایک انسان کی بقا کے لیے ہزاروں قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ انسان کے وجود کے ذرّے ذرّے کے لیے قربانی ہوتی ہے۔ پس جب ایک انسان کے لیے اتنی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تو سمجھ لو کہ جماعت کی ترقی کے لیے کسقدر قربانیوں کی ضرورت ہو گی۔ تم نے ساری دُنیا کو مسلمان کرنا ہے اور ساری دُنیا میں توحید کو پھیلانا ہے۔ اگر ایک شخص قربانی کرے تو کیا یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔ اس زمانہ میں تلوار کی قربانی کی ضرورت نہیں۔ مگر جہاں تلوار کی قربانی کی ضرورت ہو، اس سے بھی انکار نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ کابل میں ہوا۔ ہاں جن ممالک میں ہم پر تلوار نہیں چلائی جاتی وہاں ہمیں بھی تلوار کی شہادت کی ضرورت نہیں وہاں اور قسم کی شہادت ہے۔ تلوار کی قربانی تو ایک لحظہ میں ہو جاتی ہے، مگر جس قربانی کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہر لحظہ میں کئی بار ہوتی ہے۔ حضرت صاحب نے لکھا ہے کہ امام حسین کی شہادت تو ایک شہادت ہے۔ مگر مَیں نے تو بہت سی شہادتیں دیکھی ہیں۔ اسی طرح حضرت صاحب فرماتے ہیں ؏

صد حسین است در گریبانم

کہ مجھ پر ہر وقت وہی کچھ گذرتا ہے۔ جو امام حسینؓ پر ایک وقت گذرا۔ تلوار سے ایک دفعہ فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک جوشیلا فوری جوش میں گردن کٹوا سکتا ہے، مگر جو آہستہ آہستہ قربانیاں طلب کی جاتی ہیں۔ ان کو ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ مثلاً کسی کو اگر کہا جائے کہ اس دن بھوکے کھڑے رہو۔ تو اس کے لیے مشکل ہے۔ اور اس میں صبر اور ہمّت کی اس سے بہت زیادہ ضرورت ہے جتنی تلوار کے نیچے سر رکھ دینے میں ہے تو اس وقت تلوار کی قربانی کی ضرورت نہیں، بلکہ ایسی قربانی کی ضرورت ہے۔ جس میں انسان کی ہر چیز قربان ہو۔ ایک ایک لمحہ کا فکر ایسا ہوتا ہے کہ جان کو گھلا ڈالتا ہے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (الشعرآء : ۴) یعنی کیا تو محض اس غم اور فکر میں کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے، اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔ عربی زبان میں گردن کی پچھلی رگوں تک کاٹنے کو بخع کہتے ہیں۔ گویا کہ چھری کا اس طرح چلنا کہ گردن کی پچھلی رگیں آہستہ آہستہ کٹ جائیں۔ یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک خاص ایمان نہ ہو۔

پس اس وقت ضرورت ہے کہ اسلام کے لیے اور سلسلہ احمدیہ کے لیے ہر ایک قربانی جس کی ضرورت ہو کی جائے اور جب تک تم میں سے ہر ایک قربانی نہیں کرے گا۔ اُن ترقیوں کے مُنہ نہیں

دیکھ سکو گے جو مقدر ہیں۔ زید و بکر کی قربانی تمہارے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ تمہارے لیے تمہاری اپنی ہی قربانی کام آنے والی ہے۔ اگر تم دوسروں کی قربانیوں پر خوش ہوگئے تو تمہاری مثال ایسی ہی ہوگی۔ جیسی کسی پنڈت کے متعلق مشہور ہے کہتے ہیں۔ ایک پنڈت جو صبح کے نہانے کو فرض قرار دیتا تھا۔ صبح کے وقت دریا پر گیا۔ سردی کا موسم تھا اتنی تو جرأت نہ ہوئی کہ دریا میں داخل ہو کر نہاتے۔ ایک کنکر اُٹھا کر اور اس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "تو را شنان سو مورا شنان" یعنی تیرا نہانا میرا نہانا ہی ہے یہ کہہ کر کنکر دریا میں ڈال دیا۔ راستہ میں ایک دوسرا پنڈت ملا۔ اس نے کہا بھئی کیسے نہاتے، اس نے ترکیب بتلائی۔ اس پنڈت نے اسے مخاطب کر کے کہدیا کہ "تورا شنان سو مورا شنان" اور واپس آگیا۔ پس سید عبداللطیف اور عبدالرحمٰن خان کی قربانی کو اپنے لیے کافی نہ سمجھو۔ کسی کی نماز سے اپنی نماز ادا نہیں ہوسکتی جو کچھ ان سے ظاہر ہوا۔ وہ ان کا کام تھا۔ تم اپنا فرض آپ ادا کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو توفیق عطا فرماوے کہ ہم ان قربانیوں کو ادا کریں۔ جن کی اس وقت اسلام کے لیے ضرورت ہے۔ اور ہمیں وہ دن نصیب کرے کہ ہم پوری ترقیاں دیکھیں اور اسلام اپنی اصلی شان میں آجائے۔"

(الفضل ۲۴۔ جون ۱۹۱۹ء)